کیا اسلام کا احیا خطرناک ہے؟(۴۸)

طلال اسد*

آزاد جمہوریتوں میں عصری دنیا کے بارے میں معلومات کے لئے ابلاغ عامہ کے ذرائع ناگزیر حیثیت اختیار کر گئے ہیں کہ انہیں کے ذریعے رائے عامہ تشکیل پاتی ہے' اہل دانش انہی معلومات پر انحصار کرتے ہیں اور انہیں کے تجزیوں سے مستقبل کے لیے راہ عمل متعین ہوتی ہے۔ لیکن بسااوقات یہ ماہرین (اور عوام) خود اپنی رائے اور لائحہ عمل متعین کرنے کی بجائے خود کو ذرائع ابلاغ سے حاصل ہونے والے نقطہ نظر تک محدود کر لیتے ہیں۔

کچھ عرصے سے مغربی ذرائع ابلاغ تشدد کے واقعات کی اس طرح رپورٹنگ کررہے ہیں' گویا ان کے سبھی ذمے دار مذہبی تحریکوں سے وابستہ ہیں۔ مغربی کنارے اور غزا میں یہودی مذہبی جنونی قتل و غارت میں مصروف ہیں۔ مصر میں مذہبی جنونی پولیس' قبطیوں اور اپنے دوسرے مخالفین کو ہلاک کررہے ہیں۔ الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ کا یہی حال ہے۔ ہندوستان میں اونچی ذات کے ہندو' اچھوتوں کو زندہ جلانے میں اور ایران میں مذہبی حکومت اپنے مخالفین' اقلیتوں اور ہم جنسوں پر مظالم ڈھانے میں مصروف ہے۔ امریکہ میں "حیات کے حامی" کیتھولک اور پروٹسٹنٹ' اسقاط حمل میں ملوث ڈاکٹروں کو موت کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ یہ ہے سیکولر روشن خیالی کے خلاف مذہبی جہل کا رویہ۔

کیا یہ جدیدیت کے استرداد کے مظاہر ہیں' یا ان جدید تصورات کے اظہارات ہیں' جنہیں ماضی میں کچلا جاتا رہا ہے؟ مغربی دانش وروں کے تجزیئے متنوع ہیں۔ تاہم عمومی طور پر سبھی اسلام کو دوسری مذہبی روایتوں سے زیادہ جدیدیت کا دشمن تصور کرتے ہیں۔ اسلامی جنگجو (بنیاد پرست) ایک تاریخی روایت کی پیداوار ہیں۔ تشدد موجود نہ ہو' تب بھی سیاست و مذہب کو باہم آمیز کرکے اسلام ایک خوف ناک روایت کا حامل ضرور متصور ہوتا ہے۔ ان جدید اقدار کا دشمن جو یورپ اور امریکہ کی بنیادوں میں رچی بسی ہیں۔

مذہبی تشدد سے متعلق خبروں کے ناروا ارتکاز سے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اسلام مغرب کے

---

* Talal Asad, The Muslim World, April 1997

(تلخیص : عبدالقدیر سلیم)

لیے ایک بڑا خطرہ ہے۔ اس موضوع پر خامہ فرسائی کرنے والی فوج کے ایک اہم سرخیل سیموئیل ہنٹنگٹن ہیں۔ بااثر امریکی جریدے "فارن افیئرز" میں انہوں نے بڑی تفصیل سے پیش گوئی کی کہ مستقبل قریب میں تصادم کا مرکزی نقطہ مغرب اور متعدد اسلامی کنفوشیائی (کنفوشس' قدیم چین میں مذہب کو ریاستی اُمور میں داخل کرنے والا مفکر تصور کیا جاتا ہے) ریاستوں کے درمیان ہوگا۔ اور جدید مصری مورخ بی ۔ جے ۔ ویٹی کیاٹس(Vatikiotis B. J.) کے نزدیک مغرب سے اسلام کے تصادم کا مطلب ہے پوری دنیا سے لڑائی' کیوں کہ مغرب ہی دنیا ہے۔ "اسلام کے احیائے نو کی یہ لہر نہ صرف پوری دنیا کے لئے شدید خطرے کی مظہر ہے' بلکہ یہ اس کے خلاف ایک سخت جنگ کا پرچار بھی کرتی ہے (یا کم از کم ان کے خلاف' جو اس دنیا کے قائدین ہیں)' اور اس جنگ میں دہشت گردی کے فروغ' اسے پروان چڑھانے اور اس کی منصوبہ بندی کو بالکل جائز سمجھتی ہے"۔

مشہور مستشرق برنارڈ لیوس کے نزدیک مسلم ممالک نے ایک خوف ناک سازش کے تحت بین الاقوامی روابط اور تعاون کا ایک نظام مرتب کر لیا ہے اور اپنے تمام باہمی اختلافات کے باوجود مشترک ایکشن کے لیے آپس میں معاہدہ کر لیا ہے' اور اس سلسلے میں "اسلامی لوگ" دوسرے لوگوں سے بہت مختلف ہیں۔ گویا لیوس کے خیال میں یہودیوں اور کیتھولک عیسائیوں کی کوئی بین الاقوامی تنظیمیں ہیں ہی نہیں۔ مگر سبھی "ماہرین اسلام" ایسے نہیں۔ جان اسپوزیٹو جیسے بہت سے اس خیال کے حامی نہیں۔ "فارن افیئرز" کے ایک شمارے میں لیان ہاڈر (Leon Hadar) نے کسی "خطرے" کا انکار اور جوڈتھ ملر نے اقرار کیا ہے۔ تاہم یہ بحث مغرب میں جاری ہے کہ کیا اسلام کا احیا واقعی خطرناک ہے؟ اور اس سے خطرہ کس چیز کو ہے؟ بہت سوں کے نزدیک خطرہ "مغرب کے مفادات" کو ہے' اور بعض "جدید اقدار" کو خطرے میں پاتے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ مغرب کو دوسرے مذاہب کی بہ نسبت اسلام میں تشدد اور خود سری کے رجحانات زیادہ نظر آتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ "اسلام" سے منسوب کرکے بعض واقعات و حوادث کو اچھالتے ہیں اور یہ مغربی رجحان اور زیادہ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔ مغربی ابلاغ عامہ دوسرے انسانوں پر مظالم کی بہ نسبت بعض "اہل ادب" کو ملنے والی دھمکیوں کو زیادہ اچھالتا ہے۔ مسلم انتہا پسندوں نے سلمان رشدی اور بنگلہ دیشی ناول نگار تسلیمہ نسرین کو جو دھمکیاں دیں' ان کی خوب تشہیر کی گئی۔ لیکن دلچسپ امر یہ ہے کہ مصر میں سیاسی قیدیوں پر جو مظالم ہو رہے ہیں' فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل اور کشمیریوں کے ساتھ ہندوستان جو کر رہا ہے' اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں

لیا جاتا۔ کیا ان "ادیبوں" کی زندگی دوسرے انسانوں سے زیادہ قیمتی ہے؟ یا ان کے خیال میں ان ادیبوں کو نشانہ بنا کر مسلمان دراصل مغرب کی جدید آزاد فکر کو ہدف بنا رہے ہیں؟ گزشتہ چار سالوں میں میں نے جب بھی اپنے مغربی دوستوں کو اس "اخلاقی بے انصافی" کی طرف متوجہ کیا' انہوں نے یہی جواب دیا کہ ادیبوں پر حملہ کرکے "مسلم جنونی" دراصل "آزادی اظہار" پر حملہ کرتے ہیں اور مذہب کے ناقدین کو قتل کرنے کی کوششیں ان شہری آزادیوں کو فنا کردینے کی سعی ہے' جن پر جدید معاشرے کی تعمیر ہوئی ہے۔ مگر پوچھا جاسکتا ہے کہ ہمارے کئی "سیکولر آزاد خیال" (مذہبی جنونیوں کی طرح) بہت سے ایسے اصولوں کے ساتھ بھی وہی جذباتی وابستگی رکھتے ہیں' جس کے لیے مذہبی لوگ بدنام ہیں۔ تاہم حقیقی انسانوں پر حقیقی مظالم پر ان کا خون جوش نہیں مارتا۔

یورپ اور شمالی امریکہ میں بیشتر "عوامی دانش وروں" کا یہی حال ہے۔ عبدالحارث المدنی (مصری وکیل) جو بعض غیر قانونی قرار دی جانے والی جماعتوں کے وکیل تھے اور ان کے لیے حکومت سے مذاکرات میں مصروف تھے' گرفتار اور پولیس کے زیر حراست ایذا رسانی کے بعد قتل کر دیئے گئے۔ مصر میں ایسے بہت سے واقعات رپورٹ ہوتے ہیں' مگر ان کی کوئی غیر جانب دارانہ تحقیق کی اجازت نہیں دی گئی۔ توقع کی جانی چاہیے کہ مغربی ذرائع ابلاغ اس طرح کے واقعات کا بھی نوٹس لیں گے اور رائے عامہ کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا ہے' نہ ہوتا ہے۔ کیوں؟ میرے خیال میں اس لیے کہ یہ ان علامتوں پر کوئی "حملہ" نہیں تھا جنہیں مغرب سیکولر ریاست کی محافظ قرار دیتا ہے۔

پھر اگر "اسلام" ہی مشتبہ قرار پایا ہے' تو مسلمان کس طرح قابل بھروسہ ہو سکتے ہیں؟ ابلاغ کے نمائندے اپنے ملکوں میں اسلام کو خطرہ قرار دیتے ہیں اور بہت سے دانش ور سنجیدگی سے یقین کرتے ہیں کہ "اسلامی عرب دنیا" نقل مکانی کے ذریعے اپنے مذہب کو یورپ میں داخل کر رہی ہے۔ فرانس کے وزیر داخلہ چارلس پاسک نے شمالی افریقہ سے فرانس آنے والوں کے ساتھ بدسلوکی کی سرکاری اجازت دے دی۔ تاہم یہ اعتراف ہے کہ مغربی پریس نے ان مظلوم مسلمانوں کی حمایت میں بھی آواز بلند کی۔ دی گارجین ویکلی کے ایک ہی شمارے (۱۴ اگست ۱۹۹۴ء) میں "اسلام" پر چھ سرخیاں یہ تھیں: "فرانس میں الجزائر کے انتہا پسندوں کی پکڑ دھکڑ" "ایران میں عیسائیوں کو حملوں کا سامنا" "ملائشیا' صوفیوں کو خلاف قانون قرار دیتا ہے" "تیونس نے اسلامی خطرے کو کچل دیا" "نسرین کے خلاف فتویٰ۔ دو نظریات کا ٹکراؤ" "فرانس' الجزائر پر

اپنے موقف پر سختی سے قائم ہے" یہ سب وحشت ناک خبریں مسلمانوں کے بارے میں تھیں اور سبھی کے انداز منفی تھے۔ تاہم ایک ہی ہفتے بعد اسی اخبار نے ایک مضمون میں بتایا کہ فرانسیسی پولیس کس طرح نقل مکانی کرکے فرانس آنے والوں کے ساتھ زیادتی کر رہی ہے۔ اس کے اداریے میں یہ بھی کہا گیا کہ "فرانس کی یہ سوچ غلط ہے کہ الجزائر کی فوجی حکومت کو مہاجنوں کے قرضوں کے ذریعے بچایا جاسکتا ہے یا یہ کہ اسلامک سالویشن فرنٹ پر یورپ اور امریکہ میں پابندی لگانا سود مند ہوگا" نیز یہ کہ ۱۹۹۲ء کے انتخابات کو کالعدم قرار دینے کا فیصلہ درست نہیں تھا۔ تاہم الجزائر کی فوجی حکومت کے ہاتھوں انتخابی نتائج کی تنسیخ کو اس وقت سارے ہی مغربی پریس نے سراہا تھا۔

میں یہ بات واضح کردوں کہ میں ان لوگوں سے اتفاق نہیں کرتا' جو سلمان رشدی یا تسلیمہ کے لیے سزائے موت یا کسی دوسری سزا کے قائل ہیں۔ تاہم میڈیا کی یہ تشہیر کہ (ا) جمہوریت اور رواداری کے لیے بڑا خطرہ "مذہب" ہے' (ب) اسلام ہی ہمارا سب سے بڑا دشمن ہے' (ج) ظلم و تشدد کا نشانہ بننے والے دوسرے مظلوموں کے مقابلے میں ادیبوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ ہونا چاہیے' اور (د) آزادی تقریر کو تقدس کا رتبہ دے دینا-- میں انہیں درست نہیں سمجھتا۔

(۲)

کوئی اسے جھٹلا نہیں سکتا کہ بیسویں صدی میں غیر مذہبی (سیکولر) حکومتوں کے ہاتھوں ہی انسانوں پر مظالم اور تباہی کے بڑے کارنامے انجام پائے ہیں۔ (نازی جرمنی' استالینی روس' ماؤ کا چین' وغیرہ)۔ خود امریکہ میں جہاں چرچ اور ریاست کی علیحدگی کا بڑا چرچا ہے' میکارتھی ازم' سامی نسل کے خلاف تعصب' کالے اور گورے کے درمیان قانونی تفریق' نسلیت اور غربت دور کی بات نہیں ۔ اسرائیل میں فلسطینیوں کے خلافت تفریق عام ہے۔ مغرب کے "جدید سیکولر" ملکوں میں بڑے پیمانے پر مختلف ہتھیاروں کی تیاری' ساری دنیا کے ماحول کی آلودگی' وسائل کا بے محابا استحصال' سماجی کنٹرول کی ٹیکنالوجی' اشیائے صرف کے محدود استعمال کی معیشت' جس نے ساری دنیا کو لپیٹ لیا ہے' --- کیا یہ جدید دنیا کے بڑے مسائل نہیں؟

اگر مذہب' جدید دنیا کے لیے خطرہ ہے' تو "اسلام" خطرناک ترین ہے اور یہ صرف میڈیا ہی نہیں' بلکہ دانش وروں کی سنجیدہ تحریروں کا بھی عام موضوع ہے۔ مسلمانوں کی شان دار تہذیبی تاریخ' جو ڈیڑھ ہزار سال اور تین براعظموں پر محیط رہی ہے' اسے "مذہبی تہذیب" کا نام

دے کر اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جارہا ہے۔

ان دانش وروں میں ہمدرد بھی ہیں اور معاندانہ رویے والے بھی' کسی کو یہ نظر نہیں آتا کہ اسرائیل میں گش ایمونم (Gush Emunim) یہودیت کی روح ہے' یا امریکہ میں "حامیان حیات" کے ہاتھوں اسقاط کرانے والے ڈاکٹروں کا قتل عیسائیت کی روح کو ظاہر کرتا ہے۔ لبرل اہل قلم کو اس بات پر اعتراض ہوگا کہ "ہندوئیت" کے ادعا کی حالیہ مہم ہندوستان میں ہندومت کی روح کا بروز ہے' تاہم مسلم ملکوں میں تمام آمرانہ اقدام انہیں اسلام کے توحیدی عقیدے ہی کی پیداوار نظر آتے ہیں۔

"اسلامی تہذیب" کے سلسلے میں مستشرقین کا یہ رویہ نیا نہیں۔ فان گرونے باؤم (Von Grunebaum)' گب (Gibb)' واٹ (Watt) لیوس (Lewis)' کرون (Crone) اور کوک (Cook)' جیرٹز (Geertz)' گلنر (Gellner) اور دوسرے بہت سے اسے دہراتے رہے۔ لیکن حالیہ اسلامی احیا کی مساعی کو یوں لیا جارہا ہے کہ یہ ایک "تہذیبی روح" کا پر تشدد ردعمل ہے۔ اپنی بقا کے لیے اور جدیدیت کے خلاف۔ میرے خیال میں "تہذیب" کی بجائے یہاں "روایت" کا تصور زیادہ صحیح ہوگا' جسے "جدیدیت" اور "تعقل" کے مقابلے میں غلط طور پر کھڑا کر دیا گیا ہے۔

(۳)

مسلمان ملکوں میں اسلام ایک قابل ذکر "روایت" ہے۔ یہ مسلمانوں کی زندگی کے خاصے بڑے حصہ پر محیط ہے۔ مسلم معاشرہ بحران کا شکار ہے اور یہ روایت بھی۔ اسے قابل عمل بنانے کے لیے' اس کے دفاع' اس پر تفکر اور اس کی تعمیر نو کی ضرورت ہوگی۔ نہ صرف ذہنی روایت' فلسفہ اور دینیات' بلکہ طرز حیات کی بھی توضیح اور تربیت نو کرنی ہوگی۔ لیکن "قابل عمل" بنانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ یہ تشکیل نو "لبرل پروٹسٹنٹ عیسائیت" کے خاکے پر ترتیب دی جائے۔

مسلم معاشرے دوسری تہذیبوں کے ساتھ تعامل کرتے چلے آتے ہیں۔ ان میں یونانی' ایرانی' ہندی' چینی اور افریقی معاشرے قابل ذکر ہیں۔ مسلم حکومتیں' مختلف مذاہب اور ثقافتوں کے لیے یورپین حکمرانوں سے زیادہ روادار رہی ہیں۔ یہاں یورپ ہم سے کچھ سیکھ سکتا ہے۔ مسلمانوں نے غیر مسلم رعایا کے ساتھ دوسرے درجے کے شہریوں کا سلوک نہ کیا' اور نہ مسلم شہری' "حکمران طبقہ" کہلائے۔ ان کی حکومتوں میں بہت سے عیسائی' یہودی اور ہندو' ذمہ داری کے اعلیٰ مناصب

پر فائز رہے اور مسلم شہریوں پر مقتدر ۔ شہنشاہیوں اور شخصی حکومتوں کا دور بیت چکا' لیکن ان میں رواداری کے جو اصول کار فرما تھے' وہ نہ صرف لاطینی عیسائی حکومتوں' بلکہ یورپ کی "روشن خیالی کے دور" کے بعد قائم ہونے والی ریاستوں میں بھی نظر نہیں آتا۔

بعض اسلامی تحریکوں کا انتہا پسندانہ رویہ ' جس سے آج کی دنیا دوچار ہے' اسلام کے روایتی دھارے کی پیداوار نہیں۔ یہ جدید سیاست اور ریاست کا ثمرہ ہے۔ بہت سے مبصرین نے عصری اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کا اس نقطہ نظر سے تجزیہ کیا ہے کہ "روایتی اسلام" اور "جدید ارتقا ونمو" کے درمیان ایک حقیقی خلیج ہے اصلی ("روایتی") اسلامی روایت' حقیقی طور پر جدید نہیں بن سکتی۔

میرے خیال میں یہ تجزیہ درست نہیں۔ ان مبصرین نے شاید ہی سوچا ہو کہ ان کے نتائج جدید تاریخ نویسی اور جدت پذیر ریاست کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ آج کی ریاست ایک کلیت پسند ادارہ ہے' جو پورے معاشرے کو ایک مسلسل پیداآوری پیش قدمی میں تبدیل کردینے کا رجحان رکھتا ہے۔ تاریخ میں اس کی کہیں نظیر نہیں ملتی اور یہی ایک "حوصلہ مند" اسلامی سیاست کے لیے ایک گوشہ فراہم کرتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں ایسا کوئی گوشہ نہیں ملتا۔ یہ رویہ' جو کلیت پسندانہ عزائم اور ہمہ گیری کا رجحان رکھتا ہے' کلیتاً مغربی جدیدیت کی پیداوار ہے۔

آج جن معنوں میں لفظ "ریاست" استعمال ہوتا ہے' ایسی کوئی چیز اسلامی تاریخ میں کبھی موجود نہیں رہی (نہ قدیم یورپ میں) بادشاہ تھے' حکمران خاندان تھے' جو ان مرکزی اداروں کے سربراہ ہوتے تھے' جن کے ذمے امن و امان اور قانون کا نفاذ اور ٹیکس کی وصول یابی جیسے وظائف تھے۔ لیکن آج کی وہ ریاست' جو حاکموں اور محکوموں سے ماورا ہے' جس کا قیام و بقا حکومت کا فرض ہے اور جو اپنی قلمرو میں پورے معاشرے کی تشکیل کرتی ہے' اس کا کہیں وجود نہ تھا۔

مستشرقین اور وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے قیام کے عزائم رکھتے ہیں' اسے طے شدہ امر سمجھتے ہیں کہ ساتویں صدی میں اسلام کے عروج کے ساتھ عرب میں ایک مذہبی ریاست' (ریاست الٰہیہ) قائم ہو گئی' جس میں مذہب اور سیاست باہم آمیز تھے اور پھر بعد میں اس مثالی نمونے سے انحراف یوں ہوا کہ مذہبی اور سیاسی اداروں میں خلیج پیدا ہوگئی۔ "اسلام پسندوں" کے خیال میں یہ علیحدگی اس مثال سے انحراف اور غداری تھی' جسے اہل ایمان کو پھر یکجا اور قائم کرنا ہے۔ مستشرقین کے نزدیک یہ کمزور رشتہ' ترقی پسندانہ اصلاح کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

ہے۔

مسلم علماء اب یہ سوال اٹھانے لگے ہیں کہ آیا اسلامی تاریخ کو اس انداز میں پیش کرنا درست بھی ہے؟ کیا تاریخ کی یہ توجیہہ انیسویں صدی کی پوری تاریخ نویسی کی نمائندگی نہیں کرتی' جس میں "مذہب" اور "ریاست" کو متضاد حریفوں کے طور پر پیش کیا گیا تھا؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سیاسی وظائف کے لیے کوئی الوہی اختیار طلب نہیں کیا تھا' اور آپؐ کے ماننے والے بسا اوقات آپؐ سے بحث و اختلاف بھی کرتے تھے۔ آپؐ کو اپنے ماننے والوں کی ذاتی وفاداری اور آمادگی پر انحصار کرنا ہوتا تھا' کیونکہ آپؐ کے پاس ریاست کی قوت قاہرہ نہ تھی۔ پہلے حضرت ابوبکرؓ نے عرب میں سرکشوں کے خلاف فوجی قوت کا استعمال کیا کہ انہیں مرکزی سیاسی مقتدرہ کے تابع کر دیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ مسلمان ہونے کے لیے اسلامی بادشاہ کی اطاعت ضروری ہے۔

تاہم اسلامی بادشاہ کی اطاعت بھی جدید معنوں میں اسلامی ریاست کے مترادف نہیں۔ یہ ایک الگ بحث ہے۔ تاہم میرا دعویٰ یہ ہے کہ جدید اسلامی دانش وروں کا ایک مذہبی ریاست پر اصرار ہی سارے جھگڑے کی بنیاد ہے۔ میرے خیال میں قارئین کو یہ باور کرانا غلط ہے کہ آج کی اسلامی سیاست کی جڑیں اصل سیاسی اسلام میں پیوست ہیں۔ یہ کہنا کہ اپنی اصل کے اعتبار سے --- اور فی الحقیقت --- اسلام ایک مذہبی ریاست ہے' انیسویں صدی کا یورپی تصور ہے' جو مذہب کے ارتقائی نظریات کے زیر اثر پروان چڑھا۔ اگر آج کے اسلامی جنگ جوؤں نے اسے قبول کرکے اپنا لیا ہے' تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ اسلام کا لازمی حصہ ہے۔ یہاں "سیاسی اسلام" کو رد کرنا مقصود نہیں' میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ "مذہبی ریاست" اسلامی روایت کا جزو لاینفک نہیں ہے۔

یہ کہنا بھی صحیح نہ ہوگا کہ اسلامی احیا کی ساری تحریکیں ابتر ہوتے ہوئے معاشی حالات اور مغربی نظریات ہی کا ملغوبہ ہیں۔ لوگ اپنے عصری حالات سے متاثر ہو کر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہیں' مکمل طور پر منفعل نہیں ہوتے۔ اسلامی احیا کی تحریکیں' مسلم ممالک میں مغرب کے اثر و نفوذ سے پہلے شروع ہوئیں۔ اٹھارویں صدی میں (پہلے بھی) معاشرتی اصلاح اور دینیاتی تجدید کی کئی کوششیں نظر آتی ہے۔ اسلامی مفکرین نے کتاب الٰہی کی مطلق صداقت اور روایتی علماء اور فقہا کی تشریح و تفاسیر کے درمیان تمیز پر زور دیا۔ اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ (دہلی)' محمد بن عبدالوہاب (نجدی جن کے سعودی خانوادے کے ساتھ تعاون سے موجودہ سعودی حکومت کی بنیاد

پڑی)' مغربی افریقہ میں عثمان دان خدیو (تعلیمی و سیاسی اصلاحات) ایسی چند مثالیں ہیں۔ ان سب نے قرآن کو حکم مطلق اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مثالی نمونہ تسلیم کیا ہے' لیکن ہر ایک نے اپنے عہد کے "اصل مسئلے" کے بالکل مختلف حل تجویز کئے۔ ان جیسے علماء کے ذہنی ورثا آج اپنے مسائل کے لئے جو حل تجویز کر رہے ہیں' انہیں مغربی تصورات کا رد عمل قرار دینا درست نہ ہوگا۔

مغربی ممالک میں انفرادی اور اجتماعی تشدد کا تجزیہ کریں' تو نظر آتا ہے کہ ان کے سیاسی و معاشی نظامات کی ساخت ہی میں کوئی نقص ہے۔ مسلمان اپنے ملکوں کے بارے میں یہی سمجھتے ہیں۔ اور اگر کسی معاشرے میں یہ تصور عام ہو جائے کہ وہ ایک وسیع بحران کا شکار ہے' تو متعلقہ افراد میں یہ خواہش بھی فطری ہو گی کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے اور پھر انتہا پسندی وہاں ضرور راہ پائے گی۔ یورپ کی تاریخ بھی یہی بتاتی ہے۔ اس سلسلے میں سیاسی امراض کے علاج کے لیے سیکولرازم کے داعیوں اور "اسلامی انتہا پسندوں" اور دوسرے مذاہب کے پرستاروں میں کوئی خاص فرق نہیں۔

(۴)

لیڈن میں ستمبر ۱۹۹۴ء میں ایک کانفرنس کے پیش نامے کا عنوان تھا "یورپی معاشرے میں اسلام اور سیاست"۔ اس میں کہا گیا تھا کہ مغربی یورپ میں مسلمانوں نے دنیا کو "دارالسلام" اور "دار الحرب" (دارا لکفر) میں تبدیل کردیا ہے۔ کیا ایک غیر مسلم حکومت کے ساتھ سیاسی وفاداری کا رشتہ قائم ہو سکتا ہے؟ غیر مسلم سیاسی عمل میں شرکت کی جاسکتی ہے؟

کیا یہ اسلامی فکر ہے یا مسلمانوں کے خلاف افترا؟ اس اتہام کی اساس دو مفروضوں پر ہے (ا) اگرچہ اس قدیم نظریئے کی یورپ میں کوئی بنیاد نہیں' تاہم یورپ کے مسلمان اس سے رہنمائی پا کر اپنی راہ متعین کریں گے۔ (ب) عیسائیوں کے برخلاف' مسلمان وہ کھلا ذہن نہیں رکھتے کہ ایسی قدیم تعلیمات کی نئی تفسیر و توجیہہ کر سکیں۔ یہ بات بھی نظر انداز کی جاتی ہے کہ افریقہ اور ایشیا میں مسلمانوں کی بڑی تعداد استعمار کے تحت یورپی حکومتوں کی رعایا کے طور پر رہی ہے' لیکن ان لوگوں نے ان حکومتوں کے خلاف شاذ ہی اس نظریئے کو استعمال کیا ہے۔

یورپی مورخین نے یورپ کے مسلم شہریوں کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ مذہبی اقلیتوں کو قومی دھارے سے جدا کرنے کے لیے ہمیشہ وہاں بہانے موجود رہتے ہیں۔ یورپ کی

تاریخ میں ایسے دینی لٹریچر کی کمی نہیں، جس میں کیتھولکوں کو پروٹسٹنٹ ملکوں میں، اور پروٹسٹنٹوں کو کیتھولک ملکوں میں ناقابل اعتبار ٹھہرایا گیا ہے۔ ان کی یہود دشمنی کی الم ناک داستان سے کون واقف نہیں۔ کیا ہمارے فاضل مستشرقین نے، جو آج مسلم اقلیتوں کے خلاف ہیں اس الم ناک کہانی سے کوئی سبق لیا ہے؟ یا یہود دشمنی کا ان کا ہدف اب مسلمانوں کی طرف منتقل ہو گیا ہے؟ کیا وہ آج یہود اور اہل اسلام کے لیے دوہرے معیار کے مجرم نہیں؟ قدامت پسند یہودیوں اور مسلمانوں میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں۔ مضبوط خاندانی نظام، ذبیحہ، شادی اور طلاق میں خواتین کا قانونی مرتبہ وغیرہ۔ یوں لگتا ہے کہ یورپی دانش ور، یہودیوں پر کھلی تنقید سے خائف ہیں اور اس لیے مسلمان ان کا آسان ہدف ہیں۔

یورپ کے مسلم باشندوں کو مسلم دنیا کی ریاستوں اور سیاسی تحریکوں سے پراگندہ فکر نہ ہونا چاہیے۔ لیکن انہیں یورپین قوم پرستوں کے مطالبہ وفاداری کا بھی آنکھ بند کرکے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ سیاسی عمل میں ذمہ داری کے ساتھ شرکت کی جاسکتی ہے۔ لیکن جس طرح بینکار، ٹریڈ یونین والے، دانش ور، سائنس دان اور فن کار سبھی اپنے ذاتی اور پیشہ ورانہ علائق رکھتے ہیں، جو قومی ریاست کی حدود سے ماورا ہوتے ہیں، یہودی کیتھولک اور تازہ مہاجرت اختیار کرنے والے اپنے نئے اوطان کے باہر اپنے رشتے منقطع نہیں کر لیتے، یورپی مسلمان ان سے مختلف کیوں ہوں؟

سوال کیا جاتا ہے کہ آیا مسلم معاشرے یورپ میں رچ بس سکتے ہیں؟ یہ سوال شاید ہی اٹھتا ہے کہ یورپ کے نظریات اور ادارے جدید دنیا کے ساتھ تطابق پیدا کر سکتے ہیں یا نہیں، جس میں مختلف علاقوں سے نقل مکانی کرکے آنے والے ایک اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ آخر یورپ نے یہودی معاشروں کے ساتھ اپنے رویے میں تبدیلی پیدا کی ہے یا نہیں۔ اس تبدیلی کا ایک اشارہ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی اصطلاح "یہودی ۔ عیسائی تہذیب" (Christean Civilization – Judeo) ہے، جس کے مطابق یہودیت، عیسائی تہذیب کا جزو لاینفک بن گئی ہے، محض ایک "برداشت کی جانے والی" تہذیب نہیں رہی۔ "مخالفت یہود" جذبات، یورپ میں اگرچہ بالکل ہی فنا نہیں ہوئے، لیکن جو بھی سنجیدہ دانش ور مغرب میں لبرل جمہوری روایت کا داعی ہے، خود کو یہود دشمن کہلانا پسند نہ کرے گا۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ نقل مکانی کرنے والے مسلمان، یورپی معاشرت کا حصہ نہ بن جائیں اور یورپ کے ماضی کی شاندار روایتوں میں اسلامی تہذیب کی روایتوں کے دھارے شامل نہ کر لیے جائیں۔ قرون وسطیٰ کی عیسائی تاریخ و تہذیب، مسلمانوں

کے ورثے کے ساتھ گہرا رشتہ رکھتی ہے۔

امید کی جاسکتی ہے کہ مسلم اکثریت کے ملکوں میں ایک نئی تاریخ ظہور میں آجائے' جہاں دوسروں سے ربط اور تعلق ان نئے اطوار کو جنم دے' جو ہنٹنگٹن کے تصور سے بالکل مختلف ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں' عیسائیوں اور یہودیوں کے اختلافات ایک خوش گوار معجون میں تحلیل ہو جائیں گے' نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شناخت اتنی متغیر ہو جائے گی کہ کوئی شخص کسی مخصوص اخلاقی ضابطے کا ہمیشہ پابند اور ایک تہذیبی گروہ کا مستقل رکن نہیں رہ سکے گا (جیسا کہ بہت سے "مابعد جدیدیت" مفکرین کا خیال ہے) اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر روایت کے رکن اس کے لیے تیار ہوں کہ وہ دوسروں کے ساتھ باثمر انداز میں شریک کار ہوں اور باہمی مسابقت اور مقابلے سے فائدہ اٹھائیں۔

"روشن خیالی کے دور" کے بعد کی دنیا میں "رواداری" کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسرے کے نظریئے کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے۔ موجودہ سیکولر معاشروں میں "مذہبی رواداری" کا یہی مفہوم ہے۔ مگر اب مذہب کو محض "ذاتی عقیدہ" قرار دینا مناسب نہیں۔ ایک ایسی سیاسی دنیا میں' جہاں ہر شخص اپنی تعمیر میں مصروف ہے' "مذہب" بھی عوامی شناختوں کی بنیاد بن سکتا ہے۔ یہ جمہوری سیاست کا محور ہے' جس کو نکال پھینکنا ایک غیر جمہوری فعل ہوگا۔

کیا ہم معتبر جدیدیت (مثلاً" یورپی) کے ایک واحد بنیاد پرستی کے خواب سے دامن کش ہو کر "کثیر جدیدیتوں" کی تعمیر نہیں کر سکتے؟ ساری دنیا پر اپنی ثقافتی برتری کے باوصف کتنے اہل یورپ اس راہ کو اپنائیں گے؟ یہی دیکھنا ہے۔